

# اپنا مقام پیدا کر

سیاس گل

کتابی شکل: پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

پاکستانی پوائنٹ کوئی تجارتی ویب سائٹ نہیں ہے یہاں پر موجود تمام ناولز بالکل مفت ہیں۔ اس مشن کا مقصد صرف اردو ادب کی خدمت کرنا ہے تاکہ وہ لوگ جو وطن سے دور ہیں اور اردو کتب حاصل نہیں کر سکتے، وہ یہاں سے ڈاؤنلوڈ کر لیں۔ اگر آپ اردو لکھنا جانتے ہیں تو آپ بھی روز کا ایک صفحہ کمپوز کر کے اس مشن کا حصہ بن سکتے ہیں۔ مزید معلومات کے لئے، سپر موڈز: روشنی، بسمہ، حبیب یا مینجمنٹ وقار سے رابطہ کریں، شکریہ

# اپنا مقام پیدا کر

”واہ علی بھائی! کیا آواز ہے آپ کی۔“

”آپ کو تو بڑے پکے راگ آتے ہیں کمال ہے بھائی!“ سمیر نے بھی بہن کی بات کی تائید کرتے ہوئے تو صیفی انداز میں کہا تو علی فخر سے گردن اکڑاتے ہوئے بولا۔

”ارے بیٹا! تم نے ابھی پکے راگ سنے کہاں ہیں؟ ہم تو ایسے ایسے راگ گاتے ہیں کہ آسمان سے بارش برسادیں، گلاس توڑ دیں اپنے راگ کی طاقت سے۔“

”سچی...!“ سمیر حیرانی سے بولا۔

”ہاں...!“

”اچھا تو یہ تمہاری کارستانی ہے کم بختو! ابھی ہفتہ پہلے ہی میں ایک درجن شیشے کے گلاس لائی تھی، جن میں سے اب صرف ایک بچا ہے۔ سب کے سب تمہارے اس گانے کی نذر ہو گئے۔“ صابرہ بیگم نے ان کی بات سن کر پچن سے برآمد ہوتے ہوئے ان سب کو لتاڑا۔

”اماں! وہ سارے گلاس میں نے گانا گاگا کے نہیں توڑے، وہ تو ابامیاں اور ماموں جان نے ہمیں چپ کرانے کی غرض سے یونہی اٹھا کے دے مارے تھے۔ آپ تو جانتی ہیں ناکہ ان کے نشانے انتہائی ناقص ہیں، بجائے ہمیں لگنے کے دیوار سے جا لگے اور ٹوٹ گئے۔“ علی نے تڑپ کر صفائی پیش کی۔

”ارے تمہارے ہاتھ منہ کیوں نہیں ٹوٹ جاتے؟ یہ راگ الاپتے ہوئے؟“ صابرہ بیگم غصے سے بولیں انہیں علی کے گانے اور بے روزگاری سے چڑھتی۔ جبھی اس سے ناراض رہتی تھیں۔

”اس دن کپڑے دھو کر سوکھنے ڈالے تھے۔ اچھی بھلی دھوپ تھی کہ یکایک بارش ہونے لگی۔ سارے کپڑے بھیگ گئے۔“

”آپ کے؟“ علی بولا۔

”پورے کنبے کے جو میں نے دھو کر سوکھنے کے لیے الگنی پر پھیلائے تھے۔“ صابرہ بیگم نے جواب دیا گویا وہ سچ مچ بارش کا الزام علی کے گانے کے سرد دھڑ رہی تھیں۔

”دیکھ لواں! ہمارے گانے میں کتنی طاقت ہے۔“ علی ہنسا مگر صابرہ بیگم اور بھڑک اٹھیں۔

”خاک طاقت ہے، ماں کا کام آسان تو کیا کرے گا لٹاکام میں اضافہ ہی کیے جاتا ہے۔“

”ہاں تو اور کیا کروں؟ نوکری کہیں ملتی نہیں، مزدوری ہم سے ہوتی نہیں تو اللہ نے جب اچھا گلا دیا ہے گلے میں سُردیے ہیں، تو تم مجھے گانا گا کر ہی مقام پیدا کر لینے دو۔“ علی نے سنجیدگی سے کہا۔

”اس ملک میں گندم اور بجلی تو پیدا ہوتی نہیں نوجوانوں سے۔ مقام پیدا کریں گے اور وہ بھی گانے میں، سب سے آسان کام تو اب یہی رہ گیا ہے ناچنا گانا اور بس۔ کام کے ناکاج کے دشمن انانج کے۔ ہڈ حرام کہیں کے۔“ صابرہ بیگم غصے میں بولتی چلی گئیں۔

”اماں! کوسنے تو نہ دیا کرو، دعا دیا کرو دعا۔“ علی نے افسردگی سے کہا تو زبیر احمد (ابا) بول اٹھے۔

”بیٹا جی! تمہاری اماں کی دعائیں اگر اتنی ہی جلدی قبول ہوتیں تو آج تم کسی دفتر میں آفیسر نہ لگ گئے ہوتے اور یہ شہر میں“ پیرنی، ”مشہور ہو گئی ہوتیں۔“

”ہاں رہنے دو میاں!“ صابرہ بیگم نے شوہر کو تیکھی نظروں سے دیکھا اور سنجیدگی سے کہنے لگیں۔

”ماں کی دعا سے بڑھ کر کچھ نہیں ہوتا اور جس اولاد کے ماں باپ زندہ ہوں، اس کے لیے دن رات دعائیں مانگتے ہوں، اسے بھلا کسی پیر فقیر کے پاس جا کر دعا کرانے کی کیا ضرورت ہے۔ ماں کی دعائیں غرض اور ریاضاتیں نہیں ہوتی۔“

”نیک بخت! تو ٹھیک کہہ رہی ہے میں تو مذاق کر رہا تھا۔“ زبیر احمد نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ سر جھٹک کر بولیں۔

”ساری زندگی مذاق کرتے ہی گزر گئی آپ کی۔ اس پر سونے پہ سہاگہ اولاد بھی کسی معاملے میں سنجیدہ نہیں ہوتی۔ سوچا تھا علی پڑھ لکھ کے کچھ بن جائے گا۔ اس کا بھی معاشرے میں ایک مقام ہوگا، مگر...“

”اماں! اگر میں سنگمر بن گیا تو...؟“ علی کی بات ادھوری رہ گئی۔

”تو میں تجھے جوتے مار مار کے گھر سے نکال دوں گی۔“ صابرہ بیگم نے اس کی بات کاٹ کر غصے سے تنبیہ کی۔

”کیوں اماں؟“ علی جھلا گیا۔

”کیونکہ لوگ چار دن تو تیرا گانا سنیں گے، برداشت کریں گے اور جب ان کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو جائے گا تو آخر کو وہ جوتے ہی ماریں گے نا، تمہیں پھولوں کا ہار تو پہنانے سے رہے تو کیا اچھا نہیں ہوگا۔ ماں کے ہاتھ سے جوتے کھا لو تا کہ تکلیف کم ہو۔ بجائے اس کے کہ لوگوں سے جوتے کھا کے منہ چھپاتے اور اپنے بدن کی سکائی کراتے پھرو۔“ صابرہ بیگم نے حد درجہ بُرائی کھینچا تھا، علی تو علی، سدرہ اور سمیر کا بھی دل بچھ سا گیا تھا۔ جو علی کی آواز کو دل سے سراہتے تھے آخر کو وہ ان کا بڑا بھائی تھا۔

”کیسی ماں ہیں آپ! حوصلہ افزائی کے دو بول تک نہیں بول سکتیں الٹا کمزور کر رہی ہیں مجھے۔“ علی نے دکھی ہو کر کہا تو وہ سنجیدگی سے بولیں۔

”تو اچھی سی نوکری کر لے میں تیرے تین بول پڑھوادوں گی۔ نوکری ملے گی نا چھو کری ملے گی۔ چار دن کی شوشا ہے یہ گانا بجانا۔“

”ٹھیک کہہ رہی ہیں خالہ آپ! جسے کچھ کرنا نہیں آتا آج کل وہی گانا گارہا ہے۔“

”ٹھمن، علی کی خالہ زاد نے بیرونی دیوار سے سر نکال کر کہا وہ ان کی پڑوسی بھی تھی، دیوار کے پار ان کی آوازیں اس کے کانوں تک آرہی تھیں۔ ٹھمن اسکول ٹیچر تھی، ایم اے انگلش کیا تھا۔

”اے جی جی تو موسیقی پہ زوال آیا ہوا ہے۔ ہر کوئی گلا پھاڑ رہا ہے کسی کے کانوں کو بھلا لگے یا بُرا، اس سے کوئی غرض نہیں ہے، بس گلا پھاڑنے سے غرض ہے۔“ صابرہ بیگم نے دل کھول کر گانے والے نوجوانوں کی حوصلہ شکنی کی۔ علی نے شعلہ بار نظروں سے ٹھمن کو دیکھا جو اسے منہ چڑا رہی تھی۔ علی غصے سے بول پڑا۔

”تمہیں اپنے گھر میں کوئی کام نہیں ہے کیا؟ استانی جی بنی پھرتی ہو اور لوگوں کے گھروں میں جھانکتی ہو۔ دیواروں سے چپکتی ہو ہر وقت، چھپکلی ہو کیا؟ چلو اترو نیچے۔“

”ہو نہہ!“ ٹھمن نے سر جھٹک کر کہا اور نیچے اتر گئی۔

”تم کیا جانو کہ میں دیوار سے کیوں چپکی رہتی ہوں، صرف تمہیں دیکھنے کے لیے، تمہاری دلکش آواز سننے کے لیے مگر... پتا نہیں تم میرے دل کی آواز کب سنو گے؟ کبھی سن بھی پائو گے یا نہیں؟“ ٹھمن نے بند آنکھوں میں دراز قد، کسرتی بدن والے خوب صورت خدو خال کے حامل علی کی صورت کو محسوس کرتے ہوئے اس کو دل میں مخاطب کیا تھا۔

”ٹھمن سے نہ بھڑا کر سمجھا۔“ صابرہ بیگم نے علی کو ڈانٹا۔

”ہاں خود تو بے عزتی کرتی ہو، پڑوسیوں سے بھی کروایا کرواب۔ ایک نوکری نہیں ہے میرے پاس تو میں دو کوڑی کا ہو گیا آپ کی نظر میں۔ ٹھیک ہی کہتے ہیں لوگ، ماؤں کو بھی کمائو پوت ہی پیارے ہوتے ہیں۔“ علی نے دکھی لہجے میں کہا۔

”بانولا ہو گیا ہے کیا“ بس بکے جاتا ہے۔ چل اٹھ جا کے دیکھ پڑ سیوں کی مرغی نے انڈا دیا کہ نہیں۔“ صابرہ بیگم نے ایک دم قدرے نرم پڑتے ہوئے اس کے کندھے پہ ہلکا سا ہاتھ مار کر کہا انہیں اپنے رویے، لہجے اور لفظوں کی سنگینی کا احساس ہو گیا تھا۔

”اگر دیا ہو تو۔“ علی فوراً پرانے موڈ میں آ گیا، وہ ایسا ہی تھا اپنا درد چھپا کر مسکرا نے والا۔

”تولیتا آئیو۔“

”کیا مرغی یا انڈا؟“

”انڈا!“

”کتنے کا دے گی؟“ علی شرارت سے پوچھ رہا تھا اب سب مسکرا رہے تھے۔ ماں بیٹے کی

نوک جھونک پر۔

”کون کتنے کا دے گی؟“

”مرغی انڈا کتنے کا دے گی؟“

”بانولا ہوا ہے کیا؟ مرغی بھی بھلا کبھی اپنے منہ سے اپنے انڈے کی قیمت مانگتی ہے، چپکے سے اٹھالا ئیو۔“

”انڈا یا مرغی؟“ علی نے مزید تپایا۔

”کم بختی مارے، ٹھہر جا، تیری عقل تو میں ٹھکانے لگاتی ہوں ابھی، رک ذرا بھاگ کہاں رہا ہے؟“

”انڈا لینے۔“

وہ صابرہ بیگم کے تیور بھانپ گیا تھا اس سے پہلے کہ ان کے ہاتھ پاؤں سے چپل اتارتے وہ نو دو گیارہ ہو گیا تھا۔

صدرہ، سمیرا اور زبیر احمد کی ہنسی نہیں رک رہی تھی۔

”ویسے اچھا سبق دے رہی ہو بیٹے کو انڈا چرانے کا۔“ زبیر احمد نے صابرہ بیگم کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”آئے ہائے میں تو یو نہی اسے بہلا رہی تھی۔“ انہوں نے ہاتھ سے مکھی اڑاتے ہوئے نظریں چرا کر کہا۔



”بہلار ہی تھیں یا اب تک چوری کے انڈے ہمیں کھلار ہی تھیں؟“ زبیر احمد نے جرح شروع کی۔

”ایک تو تمہاری بچت کرو“ اوپر سے باتیں بھی سنو۔ پتا بھی ہے کچھ دس روپے کا ایک انڈا ملتا ہے، اتنا مہنگا ناشتہ کہاں سے لائوں میں؟ اور یہ جو پڑوسیوں کی مرغیاں ہماری چھت پر آ کے دانا پانی کھاتی پیتی ہیں، ہماری مرغیاں پچھلے سال ان کی بلی نے کھالی تھیں۔ ان کا بھی تو کوئی حساب کتاب ہے کہ نہیں، وہ مفت کی نہیں تھیں اور جب ہماری چھت پر آ کر بیٹ کر جاتی ہیں تو انڈا دیتے ہوئے موت آتی ہے کیا۔ دس میں سے ایک مرغی کے انڈے اگر ہم نے کھالیے تو کون سی قیامت آگئی۔“ صابرہ بیگم کا تو پارہ آسمان کو چٹھور ہا تھا اور ان کی باتیں سن کر سردہ اور سمیر کی ہنسی بند نہیں ہو رہی تھی۔ صابرہ بیگم کی نظر پڑی تو توپوں کا رخ ان کی طرف ہو گیا۔

”تمہارے بہت دانت نکل رہے ہیں، کیا کسی ٹوتھ پیسٹ کا اشتہار فلم بند کروا رہے ہو۔“

”ہاں!“ سمیر ہنستا ہی رہا اور زبیر احمد دل ہی دل میں دعا کر رہے تھے کہ ان کے گھر آنگن میں اسی طرح ہنسی گونجتی رہے۔

زبیر احمد اور صابرہ بیگم کا تعلق متوسط طبقے سے تھا۔ زبیر احمد سرکاری محکمے میں ہیڈ کلرک تھے۔ اس مہنگائی میں بس سفید پوشی کا بھرم جیسے تیسے رکھے ہوئے تھے۔ علی، سمیر اور سردہ ان کے تین ہی بچے تھے۔ تینوں ہی ذہین، خوش شکل، خوش مزاج اور لائق تھے۔ علی نے ایک سال پہلے کیمسٹری میں ایم ایس سی کیا تھا، وہ بھی گولڈ میڈل اور اے پلس اے گریڈ کے ساتھ مگر تاحال ملازمت نہیں ملی تھی۔ تین ماہ کے لیے ایک کمپنی نے اسے ہائر کیا تھا مگر وہاں کسی بڑے آدمی کے بیٹے کو سفارش پر رکھ لیا گیا اور علی کی اعلیٰ ڈگری بھی اس کی سفارش نہ بن سکی اور اس کی نوکری چھین لی گئی۔ آج کل اس نے کالج جاب کے لیے اپلائی کر رکھا تھا۔ علی کی آواز شروع سے ہی دلکش تھی۔ اسکول، کالج اور یونیورسٹی میں گانے کے مقابلوں میں ہمیشہ اول رہا کرتا تھا۔

زبیر احمد بھی اس کی بے روزگاری کی وجہ سے پریشان تھے لیکن ظاہر نہیں کرتے تھے کہ علی کو مزید پریشانی نہ ہو اور ابھی تو وہ خود بھی کما رہے تھے۔ انہیں اللہ پر پورا بھروسہ تھا کہ وہ جلد ہی ان کے بیٹے کو بہت اچھا روزگار عطا کرے گا۔

سمیر ایف ایس سی کر رہا تھا اور سدرہ میٹرک میں تھی۔ چھ مرلے کے گھر میں یہ پانچ نفوس بہت محبت اور اتفاق سے رہ رہے تھے۔ بس صابرہ بیگم علی کی بے روزگاری کی وجہ سے چڑچڑی سی رہنے لگی تھیں۔ انہیں دکھ تھا کہ ان کا اتنا قابل بیٹا نوکری کے لیے مارا مارا پھر رہا ہے۔ اسی وجہ سے وہ علی کے گانے پر بھی سیخ پا ہوتی تھیں حالانکہ جب وہ اسٹوڈنٹ لائف میں گانے کے مقابلوں میں انعام جیت کر آیا کرتا تھا تو سب سے زیادہ خوشی ان ہی کو ہوتی تھی اور علی بھی کوئی بچہ نہیں تھا ماں کے رویے کی وجہ کو اچھی طرح سمجھتا تھا مگر ابھی وہ کوشش اور اللہ سے دعا کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

...☆☆☆...

”علی! ناراض ہو؟“ ثمن اس کے سامنے کھڑی پوچھ رہی تھی۔ کل کی بات اس کے دماغ میں تھی وہ منہ پھلا کر بولا۔

”تم نے کبھی راضی ہونے والا کوئی کام کیا ہے؟“

”میں تو راضی ہوں۔ تم ہی کوئی کام نہیں ڈھونڈتے کہ باقی سب بھی راضی ہو جائیں۔“

ثمن نے شرماتے ہوئے مسکرا کر معنی خیز جملہ بولا تو علی نے چونکتے ہوئے اس کے سنہری رنگت والے دلکش چہرے کو دیکھا جہاں حیا کے رنگ بکھرے تھے۔

”جس دن مجھے کوئی مل گیا نا تم کسی کام کی نہیں رہو گی۔ تمہاری یہ آزادی‘ زبان درازی‘ طعنے دینے کی عادت سب ختم ہو جائے گی۔ بس میری نوکری لگنے دو‘ پھر دیکھنا کیسے تمہیں اس گھر سے اس گھر میں لاتا ہوں۔ تم نے جتنا مجھے ستایا ہے نا دیکھنا باقی عمر قید بامشقت نہ کروادی تو میرا نام بدل دینا۔“ علی نے اس کی صورت کو دیکھتے ہوئے ذومعنی بات کہی تھی۔ وہ لمحے بھر میں اس کی باتوں کا مطلب سمجھ گئی تھی۔ جیسی خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے زبان پھسل گئی۔

”سچی...!“

”توبہ توبہ بہت ہی بے شرم لڑکی ہو تم تو۔ اپنی شادی کے ذکر پر کیسی خوش ہو رہی ہو؟“ علی نے مسکراتے ہوئے اسے شرم دلاتے ہوئے کہا۔

”میں تو اس بات پر خوش ہو رہی ہوں کہ تم بھی مجھے...“ وہ بات مکمل کیے بنا شرماتا کر ہنستی ہوئی رخ پھیر گئی۔

”تم بھی...!“ علی گھوم کر اس کے سامنے آیا اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

”یعنی تم بھی... اور ثمن اس کی بات سن کر وہاں رکی نہیں تھی، اتنی تیزی سے دروازے کی جانب بھاگی تھی کہ علی بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

ثمن، علی سے تین سال چھوٹی تھی۔ ایم اے انگلش اور بی ایڈ کیا تھا اور اس کی خوش قسمتی تھی کہ اسے فوراً ہی سرکاری اسکول میں ملازمت بھی مل گئی تھی 14 ویں اسکیل میں۔ ابھی

چار ماہ ہی ہوئے تھے اسے اسکول میں ملازمت کرتے ہوئے، نٹ کھٹ سی ثمن کے نین نقش بھی غضب کے تھے، مناسب قد تھا۔ علی جیسے خوبرونو جوان کے ساتھ کھڑی ہوئی سچی بھی بہت تھی۔ علی کی سیاہ آنکھوں میں بہت کشش تھی۔ ثمن سے علی کی لڑائیاں بھی

بہت ہوتی تھیں۔ لیکن جس دن وہ ثمن کو دیکھ نہ لیتا اس سے جھگڑ نہ لیتا اسے چین بھی نہیں آتا تھا۔ ثمن اس سے محبت کرتی ہے یہ وہ نہیں جانتا تھا آج جب جان پایا تو اس پر یہ ادراک بھی ہوا یہ انکشاف بھی اسے حیران کر گیا کہ ثمن کو دل سے چاہتا ہے اور اپنی شریک حیات کی صورت میں ثمن کو ہی اپنے ساتھ دیکھنا چاہتا ہے۔ اسی احساس محبت نے علی کو ایک انوکھی خوشی بخشی تھی اور اسے یہ اطمینان بھی تھا کہ ثمن اس کی خالہ کی بیٹی ہے اور خود اماں بھی ثمن کو اپنی بہو بنانے کے خواب دیکھ رہی ہیں۔ بس اب اسے اپنی نوکری کی فکر تھی اور وہ گانے کے لیے کسی اسپانسر کی تلاش میں تھا۔

”بھائی! یہ دیکھیں چیرٹی شو کے کارڈز اور پاسز!“ سدرہ ہاتھ میں ایک سفید لفافہ لیے پرجوش انداز میں بولتی اس کے پاس آ بیٹھی۔

میں بے روزگار ہوں، کوئی چیرٹی نہیں دے سکتا۔“ علی نے گٹار کے تار چھیڑتے ہوئے کہا۔

”آپ اس چیرٹی شو میں اپنا حصہ ڈال سکتے ہیں بھائی مفت میں گانا گائیں۔“ سدرہ نے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔



”ہوں... گڈ آئیڈیا! نیک کام سے آغاز کروں گا تو اللہ میرے کام میں برکت ضرور ڈالے گا۔ میرے مستقبل کی راہ ضرور ہموار ہو سکتی ہے۔“ علی نے پُر سوچ انداز میں کہا تو سدرہ فوراً بولی۔

”ان شاء اللہ بھائی! تو پھر آپ اس شو میں پر فارم کر رہے ہیں ناں؟“

”ان شاء اللہ!“ علی مسکرایا۔

”بس تو پھر میرے ساتھ کالج جا کر شو کے آرگنائزر سے بات کر لیں اپنا نام لکھوا دیں اور پتا ہے بھائی! وہاں کمئی بڑی شخصیات بھی ہوں گی شاید آپ کو کوئی میوزک کمپنی سائن کر لے۔“

”اللہ تمہاری زبان مبارک کرے“ میری بہن بس تم دعا کرو اور میں شو میں جانے کی تیاری کرتا ہوں اور اپنا سی ڈی بھی تیار کرتا ہوں۔ موقع ضائع نہیں کرنا چاہیے مجھے۔“ علی نے پُر جوش اور پُر امید لہجے میں کہا اور اپنے کمرے کی طرف دوڑا۔ سدرہ اس کی کامیابی کی دعا مانگتی ہوئی مسکرا دی تھی۔

...☆☆☆...

14 اگست کے سلسلے میں سدرہ کے کالج نے جو شو آرگنائز کیا تھا، اسے بامقصد بنانے کے لیے ”چیرٹی شو“ کا نام دیا تھا۔ اس کی آمدنی غریب اور مستحق بچوں کی تعلیم پر خرچ کی جانی تھی۔ علی نے خوب اچھی تیاری کی تھی۔ سدرہ اور سمیر بھی کالج جانے کے لیے تیار تھے۔ ثمن بھی علی کی کامیابی کی دعائیں مانگتی تیار ہو کر آگئی تھی۔

”بس اک تمہاری کمی تھی۔“ علی نے ثمن کو دیکھتے ہی کہا تو وہ شرمیلے پن سے مسکرانے لگی۔

”اوہو... تو یہ بات ہے۔“ سدرہ نے شوخی سے کہا۔

”ہاں یہی بات ہے کوئی شک؟“ علی شوخی سے بولا۔

”واہ بھائی واہ! شک کی تو گنجائش ہی نہیں چھوڑی آپ نے۔“ سدرہ ہنسی۔

”ہاں بس یوں کہہ لیں کہ نوکری آپ کی ہوئی تو یہ لڑکی بھی آپ کی ہوئی۔“ سمیر شرارت سے مسکراتے ہوئے بولا تو زبیر احمد کی آواز ان کی سماعتوں میں مارتی۔

”ہاں! بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے سمیر!“

اور ثمن مارے شرم کے واپس اپنے گھر کو دوڑی تھی۔

”لو ثمن آپی تو چلی گئیں اب یہ شو کیسے دیکھیں گی؟“ سمیر نے کہا۔

”کوئی بات نہیں میں ڈیجیٹل کیمرے میں مووی بنالوں گی۔“ سدرہ نے کہا۔

”ہاں یہ ٹھیک ہے۔“ سمیر نے سراہا۔

”چلیں بھیا! ہمیں وقت سے پہلے پہنچنا چاہیے وہاں۔“ سدرہ نے کہا۔

”ہاں چلتے ہیں میں ذرا اماں سے دعائیں لے لوں، کہاں ہیں اماں نظر نہیں آرہیں؟“

علی چاروں جانب متلاشی نظروں سے دیکھتا اماں کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ صابرہ بیگم جائے نماز پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ علی گھٹنوں کے بل ان کے قریب زمین پر ہی بیٹھ

گیا۔

”اماں! میں جانتا ہوں کہ آپ کو میرا گانا پسند نہیں ہے لیکن اماں آپ کو پتا ہے ناکہ گانا میرا شوق ہے اور آج میں ایک نیک مقصد کے لیے گانے جا رہا ہوں۔ میرے لیے دعا کرنا

اماں کہ اللہ مجھے اچھا روزگار عطا فرمادے۔“ علی نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے ان کا ہاتھ تھام

لیا۔

”بیٹا! جا اللہ تجھے ہر نیک مقصد میں کامیاب کرے، تجھے رزقِ حلال عطا کرے۔ اللہ تجھے

اتنادے کہ تُو رکھ رکھ کے بھولے۔“ صابرہ بیگم نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھ کر دل سے دعا

دی۔

”اللہ حافظ!“

علی نے صابرہ بیگم کا ہاتھ چوم لیا اور تیزی سے باہر نکل گیا، جہاں سبز ہلالی پرچم لہرا رہا تھا۔

امید اور کامیابی کی نئی صبح کا احساس دلارہا تھا۔ اس کے تن میں ایک نئی امنگ، نئی

ترنگ، نیا جوش اُٹ آیا تھا۔ راستے میں جگہ جگہ سبز ہلالی پرچم اور جھنڈیاں لہرا رہی تھیں۔

علی سینے پر قومی پرچم کانچ لگائے، قومی پرچم کو محبت اور عقیدت سے دیکھتا کالج کے اسٹیج پر

پہنچا اور جب اس کے لب واہوئے تو بہت سریلی اور دلکش آواز میں ملی نغمہ فضا میں بکھرنے

لگا۔

وطن کی مٹی سلام تجھ پر

تمام ہر احترام تجھ پر

یہ کہکشاں، یہ مہر و انجم

نثار ماہ تمام تجھ پر

وطن کی مٹی سلام تجھ پر

کہ صبح جس کی نہ ہو درخشاں

کبھی نہ آئے وہ شام تجھ پر

وطن کی مٹی سلام تجھ پر

کبھی جو دشمن نے آزمایا

فدا یہ ہوں گے غلام تجھ پر

وطن کی مٹی سلام تجھ پر

پڑی ضرورت تو واردیں گے

یہ شان و شوکت یہ نام تجھ پر

وطن کی مٹی سلام تجھ پر

وہی ہے شاعر محبتوں کا

جو لکھ رہا ہے کلام تجھ پر

وطن کی مٹی سلام تجھ پر

مدام تہذیب بھیجتا ہے

وطن کی مٹی سلام تجھ پر

ملی نغمہ ختم ہوتے ہی کالج گراؤنڈ تالیوں سے گونج اٹھا۔ علی کا دل خوشی اور تشکر سے جھوم رہا تھا۔ ونس مور، ونس مور کی آوازیں گونجنے لگیں۔ علی نے دو مزید گیت سنائے اور تالیوں کی گونج میں اسٹیج سے نیچے اترا۔

”بہت خوب مسٹر علی! ماشاء اللہ بہت دلکش آواز ہے آپ کی۔“ ایک سوٹڈ بوٹڈ شخص نے بیک اسٹیج آکر علی کو سراہتے ہوئے کہا تو علی نے مسکراتے ہوئے شکریہ ادا کیا۔

”شکریہ! اچھی آواز تو اللہ کی دین ہے۔“

”بالکل اور ہم اس اچھی آواز کو البم کی صورت میں مارکیٹ میں لانا چاہتے ہیں۔ ہماری

ریکارڈنگ کمپنی نئے سنگرز کو بھی پر موٹ کرتی ہے۔ مائی نیم از سلمان رضوی! یہ میرا کارڈ

ہے۔“ سلمان رضوی نے علی سے مصافحہ کرتے ہوئے اپنا تعارف کروایا اور اپنا وزٹینگ

کارڈ علی کی طرف بڑھایا۔

”تھینک یو ویری مچ۔“

”اور ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہماری کمپنی کے سالانہ فنکشن میں بھی اپنی آواز کا جادو جگائیں،

ہم آپ کو بیس ہزار ادا کریں گے۔“

احسان رضوی جنہوں نے یہ چیرٹی شو آرگنائز کیا تھا، علی سے مخاطب ہوئے علی نے سوالیہ

نظروں سے انہیں دیکھا تو انہوں نے مسکراتے ہوئے اپنا تعارف کرایا۔

”احسان رضوی، سلمان میرے چھوٹے بھائی ہیں۔ میری ایک ملٹی نیشنل کمپنی ہے۔“

”گریٹ سر! خوشی ہوئی آپ سے مل کر، میں علی احمد ہوں اور یہ میری CV ہے۔ اگر

آپ مجھے اپنی کمپنی میں جاب دے دیں تو میں آپ کے فنکشن میں بلا معاوضہ گائوں گا۔“

علی نے فوراً اپنے بیگ سے فائل نکال کر ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا تو وہ ہنس پڑے۔

”بہت ذہین ہیں آپ، ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتے ہیں۔“

”سر! شکار تو ایک بھی بہت ہوگا، اگر تیر نشانے پر لگ جائے تو...“ علی نے دھیرے سے

ہنس کر مودب انداز میں جواب دیا۔

”ہوں... خاصے حاضر جواب ہیں آپ۔“ سلمان رضوی نے متاثر ہوتے ہوئے کہا۔

”تو پھر میں کب سے جوائن کر رہا ہوں آپ کی کمپنی؟“ علی نے ان کے چہرے کو دیکھتے

ہوئے بہت پر اعتماد لہجے میں سوال کیا تو وہ دونوں اس کی خود اعتمادی، اس کے سوال پر بے

ساختہ ہنس پڑے۔

”بھئی میری طرف سے تو آپ کل سے ہی جوائن کر لیں مگر پھر آپ کے گانے کا کیا بنے

گا؟“

”سر! گانا تو میرا شوق ہے، نوکری کے ساتھ ساتھ یہ شوق بھی چلتا رہے گا۔“ علی نے

خوشی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ سدرہ اور سمیر بھی وہاں آگئے تھے اور خوشی سے پھولے

نہیں سمارہے تھے۔

”لیکن میرا خیال ہے کہ آپ کو سنگنگ کوپرو فیشن بنانا چاہیے، آپ کی آواز بہت شان دار

ہے۔“ سلمان رضوی نے مشورہ دیا۔

”تھینک یو سر! ان شاء اللہ گانا اور جاب ساتھ ساتھ میج کر لوں گا میں۔ گانا میری پہچان بن گیا تو کمپنی جاب پر بھی اثر پڑے گا اور سر! ہمارے ہاں گانے کو مستقل پروفیشن نہیں بنایا جاسکتا۔ کمائی کا کوئی مستقل اور مضبوط ذریعہ ہونا چاہیے۔ آج کل سب مشہور سنگرز پیسہ کمانے کے بعد کوئی سائیڈ بزنس ضرور کرتے ہیں تاکہ اگر گانے میں دم نہ رہے تو دم نکلنے تک دام کسی ذریعے سے تو ان تک آتے رہیں ناں۔“ علی نے سنجیدگی سے بولا۔

”آپ واقعی خاصے ذہین اور سمجھ دار ہیں لیکن کچھ کچھ کنفیوزڈ بھی ہیں۔“ احسان رضوی

نے ہنس کر کہا تو وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”سر! ہم کنفیوزڈ قوم کے نوجوان ہیں۔“

”کنفیوزڈ قوم؟“

”ہاں نا کنفیوزڈ قوم! ہم پاکستانی کہلاتے ہیں۔ کہاں ہیں پاکستانی؟ کون ہے پاکستانی؟ تعصب

پیدا کرنے والے یا بم بلاسٹ اور ٹارگٹ کلنگ کرانے والے۔ مسجد، مدرسے والے یا پھر

اسمبلی، فیکٹری چلانے والے کون ہیں اصل پاکستانی؟ کیا آپ بتا سکتے ہیں سر! ہمیں تو یہی

نہیں پتا کہ ہمارے لیڈران اصل میں کون ہیں؟ ہمیں کیا کرنا ہے کس سمت سفر کرنا ہے؟ ہم

تو بس خوابوں، خواہشوں، نعروں اور سازشوں کے شور میں زندہ ہیں۔ پاکستانی ابھی

امپورٹ کرنے پڑیں گے شاید؟“ علی نے تلخ اور سنجیدہ لہجے میں اپنی بات مکمل کرتے

ہوئے آخری جملہ ذرا سا ہنس کر کہا تو وہ دونوں بھی مسکرا دیئے۔

”آئی ایم امپریسڈ مسٹر علی! ہمیں آپ جیسے نوجوانوں کی ہی ضرورت ہے، ہم صرف پیسہ کماتے ہی نہیں ہیں بلکہ خلق خدا کے کام بھی آتے ہیں۔ آپ کی جاب تو سمجھیں پکی، سیلری پیج بھی اچھا دیں گے آپ کو پھر آپ کی کارکردگی کو دیکھتے ہوئے اس میں اضافہ بھی کر سکتے ہیں ہم۔ ہاں مگر ایک وعدہ کرنا ہو گا آپ کو۔“

”کیسا وعدہ سر؟“ علی نے احسان رضوی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”آپ ہماری طرف سے کرائے گئے ”چیرٹی شوز“ میں بلا معاوضہ گائیں گے۔“

”سرنیک کام کے لیے تو جان بھی حاضر ہے، آپ جب کہیں گے جہاں کہیں گے میں اپنی

آواز اس نیک کام کے لیے وقف کر دوں گا۔ تھینک یو ویری مچ سر! آج میں بہت خوش



ہوں اور بہت خوش نصیب ہوں کہ مجھے یوں اچانک ملازمت بھی مل گئی اور میرے گانے کو پزیرائی بھی شکر الحمد للہ!“ علی نے جذباتی ہوتے ہوئے پُر نم لہجے میں کہا۔

”یہ سب اللہ کا کرم اور ماں باپ کی دعائوں کا ثمر ہے بھیا!“ سدرہ نے خوشی سے علی کا بازو تھام کر کہا۔

”بے شک!“ علی نے دل سے پُر یقین لہجے میں کہا۔

”تو پھر جلد ملاقات ہوگی مسٹر علی!“ سلمان رضوی اور احسان رضوی نے علی کا شانہ تھپکا اس سے ہاتھ ملا یا۔

”ان شاء اللہ!“ علی مسکرا دیا۔

”چلو گھر میں سب کو یہ خوش خبری سنائیں۔“

”سب کو یا ثمن کو؟“ سدرہ نے شوخی سے مسکراتے ہوئے شرارت بھرے لہجے میں کہا تو علی کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

”بہت بہت مبارک ہو بھیا!“ سدرہ اور سمیرا سے مبارک باد دیتے ہوئے اس سے لپٹ گئے۔

”خیر مبارک بھیا کی جان! آج اماں کو فخر سے بتائوں گا کہ ان کی دعا سے میں دنیا میں اپنا مقام پیدا کرنے کے لائق ہو گیا ہوں۔“ علی نے خوشی سے بھگی آواز میں کہا اور وہ تینوں ہنستے مسکراتے اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ جہاں سب ان کی آمد کے منتظر تھے۔ علی کی نگاہوں میں صابرہ بیگم (اماں) کا خوشی سے مسکراتا، متاثرانہ چہرہ بھی جگمگا رہا تھا۔ زبیر احمد (ابا) کی پُر وقار شخصیت میں اس کی کامیابی کا وقار بھی جھلملارہا تھا اور ثمن کا فرط مسرت سے کھلتا اثر مایا، لجا یاد لہن کا روپ دھارے حسین چہرہ بھی مسکرا رہا تھا۔ اس کی خوشیوں کو چار چاند لگا رہا تھا۔ اس کی زندگی کی نئی صبح کا پیغام دے رہا تھا۔ وہ خوش تھا بہت زیادہ خوش، آخر کار اسے معاشرے میں ایک باعزت مقام مل گیا تھا۔ اسے اس کی محنت کا پھل مل رہا تھا۔

ختم شد